تعارف شخصیات

مولانا سعید احمد جلال پوری

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین : ایک تعارف

کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود کا تعارف، عقائد ونظریات، فکر اور فلسفہ

گزشتہ چند روز سے قومی میڈیا میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تازہ سفارشات زیر بحث ہیں۔ اس سے پہلے بھی کونسل کے چیئرمین جناب خالد مسعود صاحب کے بعض بیانات پر بڑی لے دے ہوتی رہی ہے، ان سفارشات اور بیانات پر تبصرہ اور تنقید بھی لگاتار شائع ہو رہی ہے اس لئے ضروری تھا کہ ان کی فکری شخصیت کی ایک جھلک دکھا دی جائے کیونکہ عوام پاکستان کی طرح عموماً لکھے پڑھے حضرات بھی جناب چیئرمین کی شخصیت، ان کے علم وفضل، فہم وفراست اور عقائد ونظریات سے ناآشنا ہیں۔ بلاشبہ اگر وہ ان کی قدآور شخصیت ان کی مادر علمی، تربیت گاہ اور ان کے اساتذہ سے آگاہ ہوتے تو اُنہیں کونسل کی پیش کردہ سفارشات کا پس منظر سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔

ہمارے خیال میں کسی شخصیت کی شرافت و دیانت اور عقائد ونظریات کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ اس کا خاندانی پس منظر اور اس کے اساتذۂ علم وفن اور ان کی مادرِ علمی یعنی درس گاہ کا تعارف ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے اساتذہ ملحد و بے دین ہوں یا اس کی تربیت گاہ میں اِلحاد و زندقہ کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہو، تو ان اساتذہ اور تربیت گاہ سے اخذ واستفادہ کرنے والے کسی 'محقق' سے مسلمانوں کو خیر کی توقع رکھنا یا ان کی خلافِ اسلام سرگرمیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور چیخنا چلانا نہ صرف عبث ہے بلکہ لائقِ صد ماتم۔ اسی مقصد سے جناب ڈاکٹر خالد مسعود کے عقائد ونظریات اور ان کی فکری پرواز اور ان کے اساتذۂ علم وہنر کا کچھ تعارف پیش خدمت ہے۔

پیش نظر تعارف اور عقائد ونظریات ڈاکٹر خالد مسعود کے اس انٹرویو سے ماخوذ ہیں جو اُنہوں نے روزنامہ 'جنگ' کراچی کے ایک نمائندہ کو دیا اور سنڈے میگزین ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۷ء

میں شائع ہوا۔ جناب خالد مسعود اپنے والد کے بڑے بیٹے ہیں، ان کے دوسرے بھائی محمود شام ان سے چھوٹے ہیں، ان کا آبائی تعلق انبالہ سے ہے۔ آپ کے والد ماجد جناب صوفی شیر محمد صاحب مرحوم ایک نیک دل انسان اور پرانے اَحراری تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلے لاہور اور پھر جھنگ میں اُنہوں نے سکونت اختیار کی۔ متحدہ ہندوستان میں اُنہوں نے انگریز دشمنی کی پاداش میں جیلیں کاٹیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی، ہماری معلومات کے مطابق، وہ جمعیت علمائے اسلام اور تبلیغی جماعت سے بھی وابستہ رہے اور رزقِ حلال کی خاطر اُنہوں نے جھنگ میں 'ارسطو دواخانہ' کے نام سے ایک مطب قائم کیا اور زندگی بھر اسی سے وابستہ رہے۔

جس طرح موصوف صوفی شیر محمد مرحوم انگریز دشمن تھے اور استعمار کو مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف اور دشمن سمجھتے تھے، اسی طرح اُنہوں نے اپنی اولاد کی بھی یقیناً انہی خطوط پر تربیت کرنا چاہی ہوگی۔ مگر چونکہ انگریز کی عیاری اور مکاری مشہور ہے اور جس طرح شیطان اللہ کے نیک بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو ان کی اولادوں سے بدلے لیتا ہے، اسی طرح شیطان کی معنوی اولاد انگریز کی بھی یہی روش رہی ہے کہ جن کے سامنے ان کا بس نہیں چلتا، وہ اپنا بدلہ ان کی اولادوں سے لیتا ہے۔ افسوس کہ یہی کچھ موصوف صوفی شیر محمد مرحوم کی اولاد کے ساتھ بھی ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو ان کے والد ماجد نے ابتدائی طور پر اسکول پڑھایا، ازاں بعد وہ ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ اب بیٹا باپ کی فکر وسوچ کی مخالف سمت جاچکا تھا۔ چنانچہ خالد مسعود صاحب نے جھنگ کے ایم بی ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کیا، گھریلو معاشی حالات مزید تعلیم جاری رکھنے کے متحمل نہ تھے تو اسلامیہ ہائی اسکول میں ٹیچر کی نوکری مل گئی، اسی دوران ایف اے اور بی اے کیا، امتحان میں اچھے نمبر آگئے تو اسکالرشپ مل گیا۔

مزید تعلیم کے لئے لاہور کا رخ کیا، ایف سی کالج لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی ادب میں داخلہ کا امتحان دیا مگر افسوس! کہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، مجبوراً اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے اسلامیات کیا۔ اسی دوران مشہور ملحد اور صدر ایوب کے نفس ناطقہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے، جو بعد میں عیسائی ہوکر مرا، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی

میں داخلہ کی پیشکش کی اور داخلہ کا خط بھیجا۔ حسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق! کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے فلسفہ الحاد و استشراق نے اپنا کام دکھایا اور موصوف کے دل و دماغ کو 'فرسودہ مذہبی' تصورات سے پاک کردیا گیا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس فکر و فلسفہ میں مزید رسوخ پیدا کرنے کے لئے آپ کو کینیڈا میں مانٹریال مکیگل یونیورسٹی بھیج دیا گیا، وہاں سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو اُن کے استاذ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی جگہ خالی ہوچکی تھی اور ضرورت تھی کہ ان کی مسند پر ان کی فکر و سوچ کا انسان براجمان ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو اپنے اُستاذ موصوف کی خدمات کے تسلسل کو جاری رکھنے کی خدمت پر مامور کردیا گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی صحبت، تربیت اور کینیڈا کی مانٹریال یونیورسٹی کے مستشرق اساتذہ کی محنت بر آئی تو اب ڈاکٹر خالد مسعود وہ نہیں تھا جس نے جھنگ کے ایک دین دار گھرانے میں نشوونما پائی تھی اور جس کے قلب و جگر اور دل و دماغ میں انگریز اور استعمار کی نفرت کا بیج بویا گیا تھا۔ اب اس کے دل میں انگریز اور استعمار کے خلاف نفرت کے بجائے محبت و اُلفت کے جذبات تھے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

''بہت ساری چیزوں کے بارے میں اب میری رائے بدل گئی ہے۔ لیکن آزادی کا تصور، آزادی کے لئے محنت اور خاص طور پر استعمار کے ساتھ نفرت اور استعمار کے ساتھ جو ایک تعلق ہے، وہ جب تک میں باہر نہیں گیا، اس وقت تک استعمار سے نفرت کا تعلق رہا، لیکن جب خود جا کر استعماری معاشرے کو دیکھا تو پتا چلا کہ کسی حد تک ہمارا اپنا تصور محدود تھا اور ہم پوری طرح مغربی معاشرے کو سمجھ نہیں پائے۔'' (سنڈے میگزین، کراچی، ۲۸/اکتوبر ۲۰۰۷ء)

موصوف کی جب برین واشنگ ہوگئی اور وہ مسلم معاشرہ کے بجائے استعمار اور استعماری معاشرہ کو حق و صواب سمجھنے لگے تو ان کے لئے اندرون و بیرونِ ملک ہر طرح کی ترقیات اور مناصب کے دروازے کھل گئے، چنانچہ وہ اس دوران نائیجیریا گئے، ایک سال تک یونیورسٹی آف پنسلوانیا میں رہے، اور ۱۹۷۹ء میں اسکالرشپ پر امریکا چلے گئے اور وہاں کئی ایک یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے، اسی طرح دوبارہ وہ لیکچرار کے طور پر پیرس بھی گئے، مگر اس پورے عرصہ میں 'اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ' اسلام آباد میں ملازمت کرتے رہے اور ۱۹۹۹ء میں اس

عہدہ سے ریٹائر ہوگئے۔ اس عرصہ میں موصوف مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ گئے، اور اس میں سب سے اہم کردار امریکا کی 'کمیٹی اِن سٹڈی آف مسلم سوسائٹی' کی ممبر شپ نے ادا کیا، چنانچہ موصوف خود فرماتے ہیں کہ

''اس سلسلہ میں دو چیزیں میرے کیریئر میں بہت اہم ہیں، امریکا میں سوشل سائنس کی ایک ریسرچ کونسل ہے، ان کے مختلف گروپ، مختلف کمیٹیاں، مختلف فیلڈ سے ہوتی ہیں، اُنہوں نے ایک نئی کمیٹی بنائی تھی، کمیٹی اِن سٹڈی آف مسلم سوسائٹیز۔ عام طور پر امریکا میں جس سٹڈی کا رجحان ہے وہ Area سٹڈیز ہیں اور اسلام ان میں سے مڈل ایسٹ وغیرہ میں اہم پارٹ ہوتا ہے۔ یہ پہلی کمیٹی تھی جس کا فوکس مسلم سوسائٹی تھا۔ اس کمیٹی کی مجھے ممبر شپ کی آفر دی گئی، یہ ممبر شپ پانچ سال کی تھی۔ اس ممبر شپ کی وجہ سے ہر سال دو دفعہ امریکا جانا ہوتا تھا، اس کے علاوہ مختلف اسلامی ممالک میں جانا ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری دانشورانہ ڈویلپمنٹ اس فیلڈ میں زیادہ ہے کیونکہ یہ سب عالم فاضل لوگ تھے۔

پہلا دھچکا مجھے اسی وقت لگا تھا جب میں میکگل پہنچا تھا، وہاں جاکر ساری مسلم تاریخ اکائی کے ساتھ، نہ کہ ٹکڑوں میں تقسیم کرکے پڑھی۔ اسلامی تاریخ کے فوجی، معاشی، اسلامی پہلو تمام پڑھے تو وہ جو دھچکا تھا کہ ہم کس طرح اسلامی تاریخ کو سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً)

گویا امریکا اور ان کی اس کمیٹی کی ممبر شپ کی برکت سے موصوف کی آنکھیں کھل گئیں اور اب تک اُمت ِمسلمہ کے بارہ میں وہ جس خوش فہمی میں مبتلا تھے، وہ امریکی استعمار کی مرتب کردہ اُمت ِمسلمہ کی تاریخ، فوجی، معاشی اور اسلامی تصورات کی غلطی ان پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی اور وہ اپنے استاذ اور مربی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نظریۂ الحاد اور ان کی اس سلسلہ کی الحادی خدمات کے معترف ہوگئے اور سمجھنے لگے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا وجود جس طرح ان کے لئے نعمت ِغیر مترقبہ تھا، ایسے ہی پاکستان میں جاری الحادی تحریک کے لئے بھی از حد ضروری تھا، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے باہر جانے سے پاکستان کو نقصان ہوا، اُنہیں ۱۹۶۹ء میں پاکستان سے نکال دیا گیا، پہلے وہ برطانیہ گئے، پھر شکاگو یونیورسٹی میں۔'' ایضاً

ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے ان کے جوڑ بیٹھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ جس طرح وہ ایک

خالص دینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور استعمار کی چمک دمک سے متاثر ہوکر اُنہوں نے اپنے دین و مذہب، معاشی، معاشرتی اور اسلامی تاریخ سے بغاوت کی تھی، ٹھیک اسی طرح خالد مسعود صاحب بھی وہی پس منظر رکھتے تھے اور بعینہٖ اسی طرح وہ بھی امریکا، کینیڈا اور برطانیہ کی برکت سے دین و مذہب سے باغی ہوگئے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

''اصل میں ان (یعنی ڈاکٹر فضل الرحمٰن) کا تعلق ہزارہ سے تھا، ان کے والد مولانا شہاب الدین دیوبندی تھے اور وہ مولانا محمود الحسن اور بڑے جید علما کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا شہاب الدین اہل حدیث مکتبہ فکر کے امام ابن تیمیہؒ کے بہت قائل تھے، اہل حدیث ان کو بہت مانتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی مذہبی تعلیم مدرسے سے نہیں، بلکہ ان کے والد صاحب سے تھی جو لاہور میں اس وقت درس دیتے تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کی علمیت میں کوئی شک نہیں ہے، جب وہ آکسفورڈ گئے تھے تو سنا ہے کہ شیروانی اور داڑھی کے ساتھ ہاتھ میں مولویوں والی چھڑی لے کر گئے تھے، لیکن وہاں جاکر کلین شیو ہوگئے تھے۔'' (سنڈے میگزین کراچی: ۲۸/اکتوبر)

گویا جس طرح وہ ایک عالم دین کے بیٹے، دین دار، ظاہری شباہت، داڑھی، ٹوپی، شیروانی اور چھڑی وغیرہ کے ساتھ آکسفورڈ گئے اور ان کے فلسفہ استشراق سے متاثر ہوکر کلین شیو ہوگئے، موصوف خالد مسعود صاحب نے بھی ان کی تقلید کی۔ مگر اے کاش کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو پاکستان سے نکال دیا گیا اور موصوف اکیلے اور بے یارو مددگار ان کی فکر و فلسفہ کے وارث رہ گئے اور تحریک الحاد واستشراق کی بھاری بھرکم ذمہ داری ان کے ناتواں کندھوں پر آگئی۔ ظاہر ہے ان کو اس کا جس قدر قلق و افسوس ہوا ہوگا وہ خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے اسی درد و کرب کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے جس طرح اپنی دینی، مذہبی، اور فکری تبدیلی اور اس میں انقلاب کا ذکر کیا ہے اور جس طرح اُنہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے علم و فضل کی تعریف و توصیف کی ہے، اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ان کے عقائد و نظریات سے بحث کی جائے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند ایک اچھوتے عقائد و نظریات اور دین و مذہب، مسلم تاریخ اور مسلم تحریکوں کے بارے میں باغیانہ جذبات کا بھی تذکرہ کردیا جائے:

① موصوف ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے عائلی قوانین کے بہت بڑے مداح، حامی اور داعی ہیں اور نعوذ باللہ وہ اُنہیں قرآنِ مجید کے عائلی قوانین کا تسلسل سمجھتے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

''عائلی قوانین کا تعلق معاشرے سے ہے اور جو قرآنِ کریم اور سنت میں بھی عائلی قوانین ہیں اور وہ اس وقت کی معاشرتی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر جہاں جہاں ضرورت تھی۔ بنیادی طور پر قبل اسلام بھی وہ چیزیں موجود تھیں: نکاح، طلاق، وراثت یہ سب چیزیں قبل از اسلام موجود تھیں، اس میں جہاں جہاں زیادتی تھی، خاص طور پر عورتوں کے ساتھ، اس میں قرآنِ کریم میں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں ان کی اصلاح کردی گئی۔'' ایضاً

کیا موصوف سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ ان کے بقول جب قرآن وسنت کے ذریعے عائلی قوانین میں قابل اصلاح اُمور کی اصلاح کردی گئی تھی تو اب ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے جانشین خالد مسعود صاحب کو اس میں مزید تبدیلیوں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ کیا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے اصلاح طلب اُمور کی اصلاح میں کوئی کمی رہ گئی تھی؟ جس کے لئے چشم بددور ان کو میدان میں کودنا پڑا؟ اگر نہیں تو کیا یہ قرآن وسنت سے بغاوت اور ان کی توہین وتنقیص کے مترادف نہیں؟

② ان کے ہاں چار شادیوں پر قدغن ہونی چاہئے کیونکہ یہ حکم الٰہی ''اگر عدل نہ کرسکو'' کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ ارشادِ الٰہی: ''پس نکاح کرو دو دو، تین تین اور چار چار اور اگر عدل نہ کرسکو تو ایک ہی نکاح کرو۔'' کی صریح نص اور 'عدل کرسکو' کے معنی ومفہوم میں تحریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''قرآنِ مجید میں چار تک شادیاں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کی تعداد کو محدود کرنا اور پھر اس طرح مزید محدود یہ کہہ کر قرآنِ مجید میں کردیا گیا کہ عدل کرو۔ میرے خیال میں سب سے پہلے عدل شرط ہے، عدل یہ نہیں کہ آپ بیویوں کو نان نفقہ دے دیں۔'' ایضاً

موصوف قرآنِ کریم کی مندرجہ بالا آیت ''اور عدل نہ کرسکو'' کا جو مفہوم بیان فرمارہے ہیں، اگر ان کو ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ یہ معنی کس آیت، حدیث میں آیا ہے؟ یا، صحابہ کرام، ائمہ ہدیٰ، ائمہ تفسیر اور محقق علما میں سے کس نے بیان کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام، ائمہ اسلاف کی تحقیق سے

بغاوت اور ان کو جاہل و لاعلم کہنے کے مترادف نہیں؟ اگر بالفرض اس کا یہی معنی و مفہوم تھا تو کیا اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ صاف طور پر یہ نہیں فرما سکتے تھے کہ ایک سے زیادہ نکاح نہ کیا کرو؟

بتلایا جائے کہ اس مختصر سی تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے اتنی طویل تعبیر کیوں اختیار کی؟ اس کے علاوہ موصوف نے تعددِ ازواج کی ضرورت کو ایک معاشرتی ضرورت کہتے ہوئے اس کے لئے جو مثال دی ہے، ہمارے خیال میں کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، بلکہ صحیح معنی میں ایک باغیرت مسلمان کو اس کے تصور سے بھی قے آئے گی، مگر موصوف چونکہ انگریزی معاشرت کے دل دادہ ہیں، اس لئے اُنہوں نے بلاتکلف وہ سب کچھ کہہ دیا، جس کی کسی باغیرت انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی، چنانچہ پڑھئے اور سر دھنئے:

''میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اگر معاشرتی اور معاشی طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا لازمی طور پر ہے تو ٹھیک ہے، آپ اس کو اجازت دے دیجئے! صرف معاشرے پر آپ بات نہیں کررہے، اگر لوگ یہ ضرورت سمجھیں کہ ایک عورت دو مردوں سے تین مردوں سے چار مردوں سے تعلقات رکھے تو آپ اس کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے، کیوں؟ کیونکہ آپ معاشرے کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کررہے ہیں، آپ فیصلہ دیتے ہیں رواج، اقدار اور اسلامی روایات کے اوپر، تو اسلامی روایات پر اگر آپ کمپرومائز کررہے ہیں کہ آپ عدل کے بغیر بھی اجازت دے رہے ہیں تو پھر اس کا مطلب ہے واضح طور پر قرآن وسنت کی رہنمائی میں نہیں، بلکہ جو اپنی معاشرتی اقدار ہیں، ان کی راہ نمائی میں کررہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ معاشرتی اقدار اور قرآن وسنت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے۔'' ایضاً

کیا ہم ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنے کی گستاخی کرسکتے ہیں کہ ایک مرد کو چار شادیوں کی اجازت معاشرہ نے دی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ایک قرآنی حکم کے مقابلہ میں نہایت بے حیائی، بے شرمی اور بے غیرتی پر مشتمل ایک لچر، واہیات اور خود ساختہ مغربی معاشرتی ضرورت پیش کرکے ایک حکم الٰہی کی تضحیک کرنا کسی مسلمان کو زیب دیتا ہے؟ کیا کوئی مسلمان اس کا تصور کرسکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا کہا جائے کہ موصوف دانش گاہِ افرنگ سے اس قدر مرعوب ہیں کہ ان کی ہم نوائی میں وہ قرآن وسنت کے صریح احکام کی مخالفت سے بھی نہیں ہچکچاتے۔

③ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے مرتب کردہ اور صدر ایوب خان کے نافذ کردہ عائلی قوانین میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرا نکاح کرنا چاہے تو پہلے اپنی بیوی سے اجازت لے، اگر وہ اجازت دے دے تو فبہا، ورنہ اگر اس نے بلا اجازت دوسرا نکاح کیا تو اسے عائلی قوانین کی رو سے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

ظاہر ہے کہ یہ حکم قرآن وسنت کی صریح نصوص صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور چودہ صدیوں کے علمائے کرام کی تحقیقات کی کھلی خلاف ورزی ہے۔لیکن موصوف ڈاکٹر خالد مسعود اس کے جواز میں نعوذ باللہ قرآن کریم پر اپنی تحریف کا تیشہ چلاتے ہوئے کہتے ہیں:

''قرآنِ کریم میں بڑا واضح ہے کہ جہاں بھی حکم ہے، اگر تم یہ سمجھو تو دو، تین، چار شادیاں کرو، لیکن یہ یقین کرلو کہ تم عدل کروگے۔ تو عائلی قوانین بنانے والوں نے سوچا کہ عدل کی ایک صورت یہ تھی کہ جو آپ کی پہلی بیوی ہے، اگر وہ اجازت دے دے تو ٹھیک ہے، تو یہ اجازت اس عدل کو کہا گیا، جس کا قرآنِ مجید میں تقاضا ہے۔''

موصوف ڈاکٹر صاحب سے کوئی پوچھے کہ اس آیت کا جو مفہوم عائلی قوانین کے مرتبین نے اَخذ کیا ہے، کیا ان کے علاوہ کسی اور سے بھی منقول ہے؟ کیا یہ بزرج مہر حضور ﷺ، صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین سے بھی زیادہ عقل وفہم رکھتے ہیں؟ کیونکہ اُنہوں نے تو دوسری شادی کو اس عدل سے کہیں نہیں جوڑا، پھر اس کے علاوہ ان کو اس بات پر بھی سوچنا چاہئے کہ چلئے ایک شخص نے اس عدلِ اجازت کا تقاضا پورا کرتے ہوئے پہلی بیوی سے اجازت لے لی اور دوسرا نکاح کرلیا، لیکن بایں ہمہ اگر وہ عادل انسان پھر بھی پہلی بیوی کو نان نفقہ نہیں دیتا، اس کو اس کی باری سے محروم کرتا ہے یا اس پر ظلم وستم کرتا ہے یا اس سے بے اعتنائی برتتا ہے تو پھر عائلی قوانین اس مظلومہ کی کیا مدد کریں گے؟

اور وہ اس عادل کے خلاف کچھ کر بھی کیوں سکیں گے، کیونکہ وہ تو عدل کے قانونی تقاضے پورے کرچکا ہے، بتلایا جائے کہ اس پر عدل کی خلاف ورزی کا جرم کیونکر لاگو ہوگا؟ اس سے معلوم ہوا کہ عائلی قوانین عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے، بلکہ عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مسلمان مرد کو اس کے شرعی اور اسلامی حق سے نہ روکا جائے، ہاں البتہ اس کی اس طرح ذہن سازی کی جائے کہ اگر اس نے ایک سے زیادہ نکاح کئے اور اپنی بیویوں

کے برابر حقوق ادا نہ کئے تو قیامت کے دن اس کا گریبان ہوگا اور اس کی مظلوم بیویوں کا ہاتھ ہوگا، صرف یہی نہیں بلکہ قیامت کے دن ایسا شخص مفلوج کر کے اُٹھایا جائے گا۔

بتلایا جائے کہ ایک مسلمان یہ وعید سننے پر عدل و انصاف کرے گا یا محض بیوی کی اجازت دینے پر.....؟

④ خالد مسعود صاحب حالیہ بینکنگ کے یہودی سودی نظام کے بھی حامی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ قرآنِ کریم نے جس سود کی ممانعت کی ہے وہ یہودیوں کا سسٹم تھا، اب وہ نہیں ہے تو یہ موجودہ بینکنگ کا سود بالکل جائز ہے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حالیہ دور میں بینکنگ کا نظام ہے جو خالد اسحٰق صاحب کی رائے تھی، اس میں کسی قسم کا ظلم نہیں ہے اور بینکرز جو ہیں اور بینکنگ سسٹم ہے، اس میں پرانے زمانے والا یہودیوں کا گروہ نہیں ہے، بلکہ ایک سسٹم ہے جس میں یہ لوگ بیٹھ کر حساب لگاتے ہیں کہ اس سود کی شرح کیا ہوگی اور اس میں کتنا اضافہ کرنا چاہئے اور کیا کرنا ہے؟ اس میں یہ لوگ اپنے معاملات بھی دیکھتے ہیں اور سٹیٹ کے معاملات بھی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں استحصال نہیں ہے، اس لئے یہ جائز ہے اور جو حضور ﷺ کے زمانے میں جب یہودی زیادہ کاروبار کرتے تھے، اس میں یہ تھا کہ وہ جب قرض دیتے تھے اور اس کے بعد جب وہ واپس آتا تھا، سال کی بات ہوتی تھی یا چھ ماہ کی، تو اس سے کہا جاتا تھا کہ تم اس وقت پورا قرض ادا کرتے ہو، یا اس میں اضافہ کردوں؟ تو وہ کہتا تھا کہ ٹھیک ہے، ۱۰۰ کے بدلے ایک سو پچاس میں تمہیں دوں گا، لیکن ابھی نہیں دے سکتا، تو اسی طرح وہ دوگنا اور تگنا کرتے رہتے تھے، وہ نظام اب رائج نہیں ہے۔'' ایضاً

جناب خالد مسعود اگر کسی احمقوں کی جنت میں نہیں رہتے تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ کیا موجودہ سودی بینکاری میں سود کی شرح شروع سے ہی متعین نہیں ہوتی؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو اس اعتبار سے موجودہ سودی نظام یہودیوں کے سودی سسٹم سے بھی بدرجہا بدتر قرار پاتا ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے بقول یہودی تو ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں سود میں اضافہ کرتے تھے، جبکہ موجودہ نظام میں شروع دن سے ہی سود لگا دیا جاتا ہے، پھر اس کے علاوہ کیا موجودہ سودی سسٹم میں، سود پر سود نہیں لگایا جاتا؟ مثلاً اگر ایک آدمی

نے ایک لاکھ روپے بینک سے قرض لیا ہے اور اس کی سالانہ شرحِ سود دس فیصد ہے تو سال بعد اس کے ذمہ ایک لاکھ دس ہزار ہوگا اور آئندہ سال اس پر ڈبل کر کے سود نہیں لگایا جاتا؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو بتلایا جائے کہ یہودی سودی نظام اور موجودہ سودی بینکاری نظام میں کیا فرق ہے؟ اگر ان دونوں نظاموں میں کوئی فرق نہیں تو یہودی سودی نظام ناجائز اور موجودہ بینکاری سودی نظام کیونکر جائز ہوگا؟ کیا سود کے جواز اور عدمِ جواز میں سود خور کے دین و مذہب کو بھی کوئی دخل ہے؟ کہ اگر سود لینے والا یہودی ہو تو سود ناجائز اور اگر سود لینے والا مسلمان ہو تو جائز ہوگا؟ اگر ان کی یہ انوکھی منطق مان لی جائے تو بتلایا جائے کہ یہ اُصول تمام جرائم اور گناہوں پر بھی لاگو ہوگا؟ یعنی اگر کوئی غیر مسلم یہودی یا عیسائی زنا، چوری، ڈکیتی کرے تو اس کا حکم دوسرا اور اگر وہی کام کوئی نام نہاد مسلمان کرے تو اس کا حکم جدا ہوگا؟

⑤ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب جہاد کے بارہ میں بھی ظاہر ہے، وہی نظریہ رکھتے ہیں جو ان کے اساتذہ نے اُنہیں پڑھایا ہے، چنانچہ وہ مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کے خلاف کئے گئے کسی جہاد سے متفق نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو بھی پرائیویٹ جہاد کا نام دے کر اس پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہیں، اسی طرح تحریکِ شہیدین یعنی مجاہدین بالاکوٹ کی قربانیوں پر پانی پھیرتے ہوئے اسے بھی جہاد قرار نہیں دیتے، بلکہ شہدائے بالاکوٹ کی شہادت کو بھی خالص مغربی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے سکھوں کے خلاف جنگ کے بجائے مسلمانوں کی باہمی آویزش یا 'غیرت کے نام پر قتل' کا عنوان دیتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''جو کچھ ۱۸۵۷ء میں ہوا، بالکل اسی طرح آج بھی ہو رہا ہے، اس وقت بھی جو جہاد ہے مالاکنڈ، وزیرستان وغیرہ میں ہوا تھا، اب بھی وہی حالات ہیں۔ ایک فقہی سوال ہے اور ایک ہے تاریخی سوال۔ فقہی سوال تو یہ ہے کہ اس وقت بھی جہاد نہیں تھا، کیونکہ کسی کا فتویٰ نہیں تھا۔ سید احمد بریلوی کا جو جہاد ہے، وہ بھی جہاد نہیں تھا، وہ جہاد سکھوں کے خلاف نہیں تھا، پٹھانوں نے بھی ان کو مارا، پٹھان سکھوں سے نہیں ملے تھے، اُنہوں نے پٹھانوں کی عورتوں سے شادیاں کیں تو پٹھانوں کے لئے یہ مسئلہ بن گیا۔ اصل میں پرائیویٹ جہاد کی یہی خرابی ہوتی ہے۔'' (سنڈے میگزین، کراچی: ۲۸ اکتوبر)

ایسا لگتا ہے کہ موصوف اپنے آقاؤں کے خلاف کسی قسم کی کوئی بات سننا گوارہ نہیں فرماتے یہی وجہ ہے کہ انگریز بہادر کے مظالم کے خلاف جب بھی کسی نے آواز اٹھائی یا جس نے بھی کسی قسم کی کوئی تحریک بپا کی، وہ ان کے نزدیک بغاوت ہے اور بغاوت کی سزا قتل ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر خالد مسعود صاحب پاکستان کے مسلم معاشرہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انگریز کے خلاف جہاد حرام ہے، اس لئے اُنہوں نے اس کو پرائیویٹ جہاد کا نام دے کر اس کے خلاف اپنی دلی بھڑاس نکالی ہے۔

دراصل موصوف انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی تحریک، مسلمانوں کے جہاد، جنگ آزادی اور سکھوں کے خلاف حضرت اقدس سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کے جہاد، ان کی جاں سپاری اور پوری جماعت کی شہادت و قربانی سے ناراض ہیں، اس لئے وہ اس کو پرائیویٹ جہاد کا نام دے کر ان مخلصین کو باغیوں کی صف میں لا کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی شہادت کو بغاوت کی سزا کا نام دے کر ان کے قتل عام کو سندِ جواز فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر جہاد کے لئے وقت کی کافرانہ حکومت کی اجازت شرط ہے تو بتلایا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلہ میں جہاد کے وقت کس سے اجازت لی تھی؟ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے مشرکین مکہ بلکہ تمام کافر اقوام کے خلاف اپنے ۲۷ سے زیادہ غزوات میں کس کافر و مشرک حکومت سے اجازت لی تھی؟

اگر انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کا جہاد اور سکھوں کے خلاف شہدائے بالاکوٹ کی تحریک پرائیویٹ جہاد تھا تو حضرات انبیائے کرام کا کافر اقوام اور حکومتوں کے خلاف جہاد کیونکر پرائیویٹ جہاد نہیں تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو بتلایا جائے کہ حضرات انبیا کرام علیہم السلام کے جہاد پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ چلئے اگر جہاد کے لئے حکومت وقت کی اجازت شرط ہے تو بتلایا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہو یا تحریکِ شہیدین، اس میں مسلمان کس سے اجازت لیتے؟ کیا وہ انگریزوں اور سکھوں سے اجازت لیتے کہ حضور! ہم آپ کے خلاف جنگ اور جہاد کرنا چاہتے ہیں، کیا ہمیں اس کی اجازت ہے؟ تف ہے اس عقل و دانش پر اور حیف ہے اس فکر و سوچ پر۔

اس کے علاوہ ان کا یہ فرمان والا شان کہ شہدائے بالاکوٹ کی شہادت بھی سکھوں کے

مقابلہ میں نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کو پٹھانوں نے قتل کیا تھا، اس لئے کہ تحریک شہیدین کے اکابر نے نعوذ باللہ پٹھانوں کی عورتوں سے نکاح کئے تھے اور پٹھانوں کو اس پر غیرت آئی اور اُنہوں نے ان کو قتل کر دیا تھا، کیا موصوف کا یہ فرمان ان اکابر کے خلاف کھلا بہتان نہیں؟ کیا موصوف اس بہتان کا کوئی حوالہ پیش کر سکتے ہیں؟ کیا آج تک کسی مسلمان مؤرخ نے بھی ایسا لکھا ہے؟

اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو بتلایا جائے کہ موصوف کے ملحد اساتذہ اور مستشرق اکابر کے علاوہ کس مؤرخ نے یہ بات لکھی ہے؟ بلاشبہ یہ سب کچھ مغرب کے اس سبق کا نتیجہ اور اثر ہے جو موصوف نے کینیڈا، امریکا اور برطانیہ کی درس گاہوں میں بیٹھ کر پڑھا تھا اور اب خیر سے اس کو دہرا رہے ہیں۔ کیا ان کی یہ ہرزہ سرائی حضرات شہدائے بالا کوٹ کی قربانیوں پر پانی پھیرنے اور ان کی شخصیتوں کو داغ دار کرنے کے مترادف نہیں؟ کیا یہ دین دار پٹھانوں پر بھی بدترین تہمت نہیں؟ کہ ان کو ایک اسلامی لشکر کے قتل عام کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے؟ الغرض موصوف نام کے مسلمان ہیں، ورنہ ان کے دل و دماغ اور قلب و جگر میں اسلام، اسلامی قوانین، قرآن و سنت اور اُمت مسلمہ کے خلاف بغض و عداوت اور بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ موصوف اسلامی نظریاتی کونسل میں بیٹھ کر کیا کیا کارنامے انجام دے رہے ہیں اور ان کی سازشوں کا دائرہ کس قدر پھیلتا جا رہا ہے اور ان کی علمی تحقیقی حیثیت کا کیا مقام ہے؟ اس کے لئے ایک واقف حال کا درد بھرا خط پڑھئے اور سر دھنئے:

جناب مولانا سعید احمد — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روزنامہ 'اسلام' میں آپ کا مضمون 'کیا اسلام مکمل ضابطہ حیات نہیں؟' پڑھ کر دل خوش ہوا، اطمینان ہوا اور دل سے آپ کے لئے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ آپ کو برکت اور استقامت دے۔ یہ مضمون پڑھ کر احساس ہوا کہ ابھی اللہ کے بندے موجود ہیں جو جاگ رہے ہیں، اللہ نے اُنہیں بصیرت بھی دی ہے اور قوتِ گویائی بھی۔ اکبر کے فیضی اور ابوالفضل کے بیانات، تاویلات اور سفارشات اتنی ضرر رساں نہ تھیں کہ اُنہیں آئینی تحفظ حاصل نہ تھا، تب علمائے حق موجود تھے جو اکبر کی موجودگی میں حق بات کہہ دیتے، اکبر خود بھی جانتا تھا کہ فیضی اور ابوالفضل خوشامدی ہیں۔ مگر آپ نے اپنے مضمون میں جس شخص کو آج کا فیضی یا ابوالفضل قرار دیا ہے، اس کے بیانات، تاویلات، سفارشات کو آئینی حیثیت حاصل ہے۔ عوام کو بھی یہ یقین ہے کہ

اس آئینی ادارہ سے جو بیان آئے گا، وہی اسلام کی درست اور مستند تعبیر ہے، پھر علماے کرام کے اجماعی سکوت نے عوام کے اس یقین کو مزید تقویت بخشی، اگر یہ لوگ جاگ رہے ہوتے یا ان میں بصیرت ہوتی تو اس منصب پر اس شخص کی تقرری کے فوراً بعد ہی اسے بھگایا جاسکتا تھا۔

مگر ایسا نہ ہوسکا، چار سال کا عرصہ گزر گیا اور اس دوران اس نے بہت کچھ کرلیا، جو شاید آپ کے علم میں نہ ہو۔ مثال کے طور پر یہ کہ اس آئینی ادارہ میں ہر دس پندرہ دن کے بعد کوئی سیمینار/فنکشن ہوتا ہے، آئین کی رو سے اس کی گنجائش نہیں اور بہت ہرزہ سرائی کی جاتی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جب کونسل نے سفارش دی تھی کہ ضبط شدہ شراب بیچ کر اقلیتوں کی بہبود پر خرچ کی جائے تو ہمارے علماے کرام پر سکوتِ مرگ طاری رہا، مگر جے سالک نے اس پر احتجاج کیا اور اس سفارش کی سخت مذمت کی۔ اسی طرح شیطان رشدی کو سر کا خطاب ملنے سے چند روز پہلے اس کونسل نے سفارش دی کہ موت کی سزا صرف قتل عمد پر ہے یا فساد فی الارض پر۔ کسی عالم دین نے اس پر گرفت نہیں کی، البتہ برطانیہ کے خلاف احتجاج کرتے رہے کہ اس نے رشدی کو سر کا خطاب کیوں دیا؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس ادارہ کے سربراہ کے ایک خاص بیان کا آپ نے نوٹس لیا ہے، یہ بیان اخبارات میں آئے ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں، کتنے ہی دینی مجلات شائع ہوتے ہیں مگر سب کی زبانوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ أم علی قلوب اقفالہا!!

مولانا محترم! یہ شخص محض ابوالفضل یا فیضی نہیں، ..... ہے۔ اس نے شاطبی پر پی ایچ ڈی کیا ہے، کسی واقفِ حال نے کہیں کہہ دیا کہ یہ..... شاطبی کو پڑھ ہی نہیں سکتا۔ کسی نے یہ بات اس تک پہنچادی، اب اس نے کونسل کے بجٹ سے عربی پڑھانے کے لئے ایک عراقی کو رکھ لیا ہے۔ یہ اندھی اور بہری قوم خاموش ہے۔ اگر اندر جھانکیں تو اس قوم کا پیسہ نہایت بے دردی کے ساتھ ضائع کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان، آپ کے علم اور آپ کی قلم میں برکت دے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے استقامت دکھائی تو..... بھاگ جائے گا۔ والسلام

اخوکم فی الاسلام، کراچی

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمّد وآلہ وأصحابہ أجمعین